ہمیں اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ گذشتہ چند صدیوں میں اسلام کا فکری سرمایہ مدافعت کی زبان میں کیوں لکھا گیا ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ جو لوگ نظری طور پر دنیا کی قیادت کے لئے اٹھائے گئے تھے اور جنہیں آخری نبی کے متبعین کی حیثیت سے رحمت للعالمینی کا فریضہ انجام دینا تھا وہ خود کو اقوام عالم کے مقابلے میں ایک فریق کی حیثیت سے اس قدر دیکھنے کے عادی ہوئے کہ ان کی نفسیات پر مدافعت پوری طرح غالب آ گئی، تحریک دعوت یا تحریک رحمت کے حاملین تحریک مزاحمت کے ذہنی سانچے سے جب تک نہیں نکلتے ان کے لئے قرآن کے آفاقی پیغام سے فائدہ اٹھانا اور اسے بروئے کار لانا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

# تقلیبِ فکر ونظر کی دعوت

سعودی دارالحکومت ریاض کے مضافات میں جدید طرز کی قلعہ نما عمارتوں پر مشتمل ایک وسیع وعریض کیمپس واقع ہے۔ جامعۃ الامام کا یہ کیمپس جہاں دینی تعلیم وتربیت کا اعلیٰ سطح پر اہتمام پایا جاتا ہے اپنی نوعیت کا واحد ادارہ نہیں۔ مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ، مصر کا شہرۂ آفاق مدرسہ ازہر شریف اور اس قبیل کی نہ جانے کتنی دینی درسگاہیں دنیا بھر میں علوم شرعی کے حوالے سے معروف ہیں۔ ریاض شہر کی دوسری جانب کنگ سعود یونیورسٹی کا وسیع وعریض کیمپس ہے جسے سیکولر یا عصری تعلیم کے حوالے سے عالم عرب میں ایک ممتاز مقام کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ جامعہ امام اور جامعہ سعود گو کہ ایک ہی شہر میں واقع ہیں لیکن ان دونوں کی دنیا مختلف ہے۔ ایک کے یہاں صرف علوم شرعی پر زور ہے، دوسرے علوم اس کی نظر میں لائق اعتنا نہیں تو دوسری طرف عصری علوم کے حاملین علوم شرعی کو اپنے فکر ونظر کے دائرے سے خارج سمجھتے ہیں۔ علم کی یہ اسلامی اور غیر اسلامی تقسیم مسلم دنیا میں صدیوں سے رائج ہے۔ اب یہ روایت اتنی مستحکم ہوگئی ہے کہ کوئی جبیں اس ثنویت پر شکن آلود نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی کو اس خیال کی اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔

مسلمانوں کے فکری زوال کا ایک بڑا سبب علم کے سلسلے میں ان کا اپنا پیدا کردہ التباس ہے۔ جو لوگ معاصر دانش گاہوں میں تعلیم پاتے یا درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں وہ صدیوں سے اس احساس تلے جیتے ہیں کہ وہ علوم شرعی کے حاملین کے مقابلے میں کمتر درجے کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ دوسری طرف روایتی دانش گاہوں میں علماء وشیوخ اس التباس فکری کے شکار ہیں کہ وہ وارثین انبیاء اور طالبان نبوت ہیں، علم کی حقیقی خدمت صرف وہی انجام دے رہے ہیں اور ان ہی کے حوالے سے آخرت کی فلاح ونجات کا فیصلہ ہونا ہے۔

مسلمانوں میں علم شرعی کی روایت جس کا سلسلہ صدیوں سے چلا آتا ہے دراصل ان کے دورِ زوال کی پیداوار ہے۔ استعمار سے پہلے جہاں بھی جس شکل میں بھی مسلم حکومتیں باقی رہیں، مسلمانوں کی درسگاہیں علم کی اس شرعی اور غیر شرعی تقسیم سے ناآشنا تھیں۔ اس بات کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ روایتی درس گاہوں کے نصاب میں آج بھی ان علوم وفنون کے باقیات

کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں جو اپنے وقت میں عصری علوم کی ترقی یافتہ شکل سمجھے جاتے تھے۔ منطق وفلسفہ، ریاضی اور علم ہیئت، علم کلام اور عروض و بلاغت جیسے مضامین جو آج اپنی موجودہ شکل میں از کارِ رفتہ معلوم ہوتے ہیں اپنے عہد میں عصری آگہی سے واقفیت کی دلیل سمجھے جاتے تھے۔ البتہ جب سے مسلم اہلِ فکر نے یہ سمجھ لیا کہ ان دانش گاہوں کا کام اب محض دین کی حفاظت ہے اقوام عالم کی قیادت وسیادت کا زمانہ جاچکا تب سے علم شرعی کے حاملین خالصتاً مدافعت کی نفسیات کے اسیر ہوگئے۔ فکر ونظر کا یہ زوال چند برسوں کی بات نہیں بلکہ اس کی جڑیں دور بہت دور ماضی بعید میں پائی جاتی ہیں۔

دینی مدارس جو علم شرعی کے حوالے سے اپنی دینی حیثیت پر استدلال کرتے ہیں ان کے پیشِ نظر اگر صرف یہ مقصد ہو کہ وہ مسلم معاشرے کے لئے واعظ وخطیب، امام اور قراء پیدا کریں گے جس کی بہر حال مسلم معاشرے کو ضرورت ہے تو محض اس ہدف کو حاصل کرنے کے لئے اتنے بڑے پیمانے پر متخصصین کی دانش گاہیں قائم کرنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ یہ ہدف مختصر عرصے میں جز وقتی نصاب کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اگر ان کا مقصد ایسے علما ومفکرین پیدا کرنا ہے جو جدید دنیا کی فکری وعملی قیادت کرسکیں تو یہ کام یقیناً ان دانش گاہوں سے نہیں ہوسکتا جہاں قدامت کو جز ونصاب سمجھا گیا ہے اور جہاں طلباء واساتذہ کو اس بات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی جاتی کہ نئی دنیا میں اقوام وملل کے سامنے اس وقت کون سا ایجنڈا معرض بحث ہے۔

علم کیا ہے؟ الراسخون فی العلم کون لوگ ہوسکتے ہیں؟ قرآن مجید عالم کی کیا تعریف متعین کرتا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا صحیح جواب فراہم کئے بغیر ہم اس ثنویت کا پردہ چاک نہیں کرسکتے جو علم کے سلسلے میں ہمارے یہاں رائج ہوگئی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے ﴿هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون﴾ (الزمر:۹)۔ قرآن کی نگاہ میں علم کے دو مآخذ ہیں: وحی اور عقل۔ وحی وہ شاہِ کلید ہے جس سے اگر صرف نظر کیا جائے تو عقلِ بے مہار گمرہی کی طرف لے جاسکتی ہے۔ اس کے برعکس وحی کی روشنی میں عقل کا سفر انسان کو حقیقت کی نقاب کشائی کا متحمل بناتا ہے۔ وہ لوگ جو آیت اللہ پر غور وفکر کے ذریعہ خالق کا عرفان حاصل کرسکیں اور جن کے قلوب اس کی خشیت اور جاہ جلال سے مبہوت ہوجائیں وہی لوگ ہیں جنہیں صحیح معنوں میں عالم کہا جاسکتا ہے۔ ﴿انما يخشى الله من عباده العلمؤا﴾ (فاطر:۲۸)۔ قرآن مجید کے نزدیک رسول کا فریضہ یہ ہے کہ وہ خدا کی آیات کی تلاوت کے ذریعے انسانوں کے قلب ونظر کی تشکیل کرتا اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ کتاب کے ساتھ حکمت کا بیان اور خود رسول کو اس کارِ حکمت پر مامور کرنا اس بات پر دال ہے کہ قرآن جو انسانوں کے لئے شاہ کلید ہے اس کو برتنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے عقلی رویے کی ضرورت ناگزیر ہے۔ دل ودماغ کو متحرک کئے بغیر اس کتاب سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔

حکمت کیا ہے؟ بعض متقدمین کو کتاب کے ساتھ حکمت کے تذکرے سے یہ اشتباہ پیدا ہوا ہے کہ کتاب اگر قرآن ہے تو

حکمت سنت۔لیکن قرآن مجید کی ان تمام آیات کو سامنے رکھنے سے، جہاں مختلف سیاق میں حکمت کا لفظ وارد ہوا ہے، اس خیال کی تصدیق نہیں ہوتی۔اس کے برعکس حکمت کے معنی ایک عقلی رویے کی تشکیل اور دل ودماغ کو متحرک رکھنے سے عبارت ہے۔اس بات کی تائید جابجا آیت حکمت کے مطالعے سے ہوتی ہے جیسا کہ حضرت داؤد کے حوالے سے وارد ہے کہ انہیں اللہ نے اقتدار اور حکمت سے نوازا (بقرہ:۲۵۱)۔اسی سیاق میں آگے ارشاد ہے ﴿یؤتی الحکمة من یشاء و من یؤت الحکمة فقد أوتی خیرا کثیرا﴾ (البقرۃ:۲۶۹)۔ایک دوسری جگہ آل ابراہیم کے حوالے سے انہیں کتاب وحکمت اور ملک عظیم عطا کرنے کا تذکرہ ہے (نساء:۵۴)۔سورہ نساء میں مسلمانوں کو یہ مشورہ بھی دیا جارہا ہے کہ وہ لوگوں کو دین کی دعوت دینے میں کمال حکمت اور موعظۃ حسنۃ سے کام لیں۔قرآن کی لغت میں حکمت دراصل ایک بہت جامع لفظ ہے۔یہ ایک ایسا ذہنی رویہ ہے جو انسانی دل و دماغ پر وحی کی ضیاپاشیوں سے تشکیل پاتا ہے۔اس کے برعکس خالص تعقل پسندی انسان پر ان امور کی نقاب کشائی نہیں کرسکتی جو وحی کا طرۂ امتیاز ہے۔

عہد رسولؐ کی تہذیبی اور فکری زندگی پر غور کیجئے۔توحید خالص کی دعوت نے اوہام وخرافات میں ڈوبے ہوئے بت پرست معاشرے میں ایک ایسی ہلچل پیدا کردی تھی کہ نفع ونقصان کے میزانیے کو لات ومنات سے وابستہ کرنے کے بجائے خالص عقل کی کسوٹی پر دیکھا جانے لگا۔قرآن اہل کفر کے سلسلے میں بار بار یہ کہتا ہے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے، صاف روشن حقیقتوں پر غور و فکر نہیں کرتے۔اسی طرح قصۂ ابراہیم میں اس عقلی مکالمے کو ملاحظہ کیجئے جہاں اصنام پرستی کے خلاف یہ دلیل لائی گئی ہے کہ جو بت اپنے نفع ونقصان پر قادر نہیں وہ بھلا دوسروں کو کیا فیض پہونچا سکتے ہیں۔دل اگر حق کا متلاشی ہو تو وہ عقل کے سہارے منزل مراد کو پہنچ سکتا ہے۔یہی ہے کتاب وحکمت کے امتزاج کا ماحصل۔

ابتدائی عہد میں مسلمانوں کی پہلی نسل جس حیرت انگیز طریقے سے اقوام عالم پر اپنی فضیلت قائم کرتی رہی اس کے پیچھے ایک بڑا محرک کتاب وحکمت سے تشکیل پانے والا قلب سلیم تھا۔عہد اولیٰ میں ہمارے علماء ومفکرین کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ ہمارا کام صرف علم شرعی کی تحصیل وتحفیظ تک محدود ہے۔رہی خدا کی کائنات کی تسخیر اور اس میں پائی جانے والی مختلف اقوام وملل کی امامت تو اس دنیاداری سے بھلا علماء کرام کا کیا واسطہ۔بلکہ سچ پوچھئے تو ابتدائی عہد میں تفقہ فی الدین کی بات تو سنائی دیتی ہے البتہ علم کی شرعی اور غیر شرعی تقسیم کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

ابتدائی عہد میں ہمارے لئے یہ خیال بھی اجنبی تھا کہ مسلمانوں میں عامۃ الناس سے الگ، علم دین کے حوالے سے، علماء و مشائخ کا کوئی طبقہ اپنی علیحدہ حیثیت اور فضیلت پر اصرار کرے گا۔آج جو پوری دنیا میں مسلمانوں کے مابین علماء وشیوخ کا ایک طبقہ دیکھنے کو ملتا ہے جس نے اپنے لباس، عادات واطوار اور طریقۂ کلام سے اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے ممیّز کر رکھا ہے، کسی

ایسے طبقہ کا وجود کم از کم پہلی صدی ہجری کے آخر تک نہیں پایا جاتا۔ علم کے حوالے سے طبقۂ علماء کی باضابطہ تشکیل کا کام عہد عباسی میں انجام پایا۔ قاضی ابو یوسف اسلام میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے لئے عام لوگوں سے الگ ایک ایسے مخصوص لباس کا تعین کیا جسے عہدۂ قضا کے حوالے سے رفتہ رفتہ طبقہ علما میں قبولیت حاصل ہوگئی اور جسے آج مختلف شکلوں میں، مختلف معاشروں میں علماء اسلام نے اختیار کر رکھا ہے۔ یہی عہد علم کے حوالے سے ائمہ محدثین اور ائمہ فقہاء کے ظہور کا بھی ہے۔ اسی عہد میں قراء کے مقابلے میں محدثین کی سماجی حیثیت بڑھتی گئی اور یہ خیال عام ہوا کہ اصل علم روایتوں کی تجمیع اور تحفیظ سے متعلق ہے۔ اسی عہد میں عالم کی قرآنی تعریف التباس فکری کا شکار ہوئی اور پھر آگے کی صدیوں میں رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک آپہونچی کہ باقاعدہ علوم کی شرعی اور غیر شرعی تقسیم عمل میں آگئی۔ غیر شرعی علوم کے سلسلے میں چونکہ یہ خیال عام ہوا کہ وہ دنیاداروں کا میدان ہے اس لئے عام مسلم ذہنوں میں تسخیر کائنات کے سلسلے میں بے توقیری کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس کے برعکس علماء و مشائخ نے آخرت کے حوالے سے معاشرے میں اپنی سماجی توقیر میں خاصا اضافہ کرلیا۔ آگے چل کر جو لوگ تسخیر کائنات کے علوم سے وابستہ رہے یا جنہوں نے مسلم معاشرے میں سائنس و طب کی بیش بہا خدمات انجام دیں وہ بھی ایک طرح کے احساس پشیمانی سے دوچار رہے، انہیں ایسا لگتا تھا جیسے علوم شرعی کے مقابلے میں تسخیر کائنات کے شعبے سے ان کی وابستگی کوئی گھٹیا درجے کا فریضہ ہے۔ اس طرز فکر نے رفتہ رفتہ مسلم معاشرے کو تسخیر کائنات کی قرآنی دعوت سے غافل کردیا۔ علم کے نام پر اب ہمارا کل سرمایہ علوم نقلیہ تک محدود ہوگیا اور علماء کا یہ وظیفہ قرار پایا کہ وہ متقدمین کی کتابوں سے ان کے فہم دین کو ہم تک منتقل کرتے رہیں۔ بلکہ بعد کے عہد میں تو علماء نے یہ کام بھی اپنے ذمہ لے لیا کہ وہ متقدمین کی تشریح و تعبیر کے علاوہ ہرگز کسی نئی فہم کو اعتبار عطا نہیں کریں گے۔

فی زمانہ علم کے حوالے سے مسلم دنیا جس التباس فکری کی شکار ہے کچھ یہی صورت حال اہل یہود کے ربائیوں نے بھی کوئی دو ہزار سال سے پیدا کر رکھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ فقہاء یہود کے نزدیک زندگی کا بنیادی وظیفہ توراۃ کا پڑھنا پڑھانا، اس کی تشریح و تعبیر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ حتیٰ کہ روزی کمانے کے لئے بھی حیلِ شرعی کے ذریعہ یہ راستہ نکالا گیا کہ اس کی اجازت صرف اس شکل میں دی جاسکتی ہے جب کمانے والا اس نیت سے کمائے کہ وہ توراۃ کے طالب علموں پر اپنی کمائی صرف کرنا چاہتا ہو۔ رہا توراۃ کے علاوہ کسی اور کتاب کا مطالعہ تو فقہاء یہود کے نزدیک یہ ایک سنگین جرم تھا۔ معبد کی دوسری تباہی کے بعد اہل یہود کے تمام بڑے دماغ علم شرعی کے سلسلے میں پیدا کردہ اپنے اس مغالطے کے اسیر رہے۔ ایسا نہیں کہ ان کے یہاں دو ہزار سالوں میں بڑے دماغ پیدا نہ ہوئے ہوں لیکن ان کی تمام تر تر کتازیوں کا میدان ربائی ادب کی قیل و قال رہی۔ ان کے بہترین دماغ اس طرح کی شرعی بحثوں میں اپنی قوت ضائع کرتے رہے کہ سبت کے دن کس کس عمل سے اس کی حرمت پامال ہوسکتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ بات بھی موضوع بحث بنی کہ خدا ترس یہودی سبت کے دن ٹوائلیٹ فلش کرسکتے ہیں یا نہیں۔ دنیا ان دو ہزار سالوں میں اہل یہود

کے کسی بڑے دماغ سے نا آشنا رہی۔ البتہ جب اٹھارہویں صدی کے آخر میں مشرقی یوروپ میں ان کے بعض فقہاء نے حیلِ شرعی کے سہارے شرعی علوم کے علاوہ دوسری کتابیں پڑھنے کی راہ نکالی تو انیسویں اور بیسویں صدی میں اہل یہود کے خانوادہ سے علماء ومفکرین کا ایک سیلاب سا آ گیا۔

راسخ العقیدہ یہودی جزئیات ورسومات کی بڑی باریک بینی سے پابندی کرتے ہیں۔ حضرت مسیحؑ کے الفاظ میں 'مچھر چھاننے اور اونٹ نگل جانے' کا محاورہ ان پر صادق آتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے یوروپ میں جب دنیا صنعتی انقلاب کی اتھل پتھل سے دوچار تھی، اہل یہود کے ربائی اپنی قوم کو اس بات کی اجازت دینے کے لئے تیار نہ تھے کہ وہ نئے انقلاب کی ماہیئت اور اس کے اسباب کا مطالعہ کریں۔ مگر انسانی شب وروز میں کچھ لمحات ایسے بھی تو ہوتے ہیں جب توراۃ اور مذہبی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر بیت الخلا میں جو وقت گزرتا ہے، کیا اس دوران سیکولر علوم کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے؟ بعض یہودی فقہاء نے ایسے اوقات میں دنیوی علوم کے مطالعہ کی اجازت دیدی۔ پھر کیا تھا جسے دیکھئے اس فقہی گنجائش سے فائدہ اٹھانے لگا۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں مشرقی یوروپ کے یہودی گھرانوں میں گھنٹوں بیت الخلا میں وقت گزارنے کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس عہد میں عام طور پر اہل یہود کے اہلِ فکر قبض کی شکایت کرتے نظر آتے ہیں۔

اہلِ یہود کے ہاں اس حیلِ شرعی کے ذریعہ دنیوی علوم پر لگی پابندی کا جو بند ٹوٹا ہے تو پھر یہ سلسلہ روکے نہیں رکا۔ دیکھتے دیکھتے انیسویں اور بیسویں صدی میں قوم یہود سے علماء ومفکرین کی ایک فوج نکل آئی جن کے دل ودماغ نے انیسویں اور بیسویں صدی کی بساط سجانے میں کلیدی رول ادا کیا۔ اہل یہود کے اس تجربہ میں ہم مسلمانوں کے لئے عبرت کا بڑا سامان پوشیدہ ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے یہاں شرعی اور دنیوی علوم کی ثنویت دور کرنے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں البتہ اب تک ہمارے علماء اس ادراک سے خالی رہے ہیں کہ علم کے سلسلے میں اس التباس نے ہمارے زوال میں کلیدی رول ادا کیا ہے اور یہ کہ اس ثنویت کو دور کئے بغیر ہم سیادت کے راستہ پر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ابو حامد غزالی نے احیاء العلوم میں ایک جگہ لکھا ہے کہ مسلمانوں کو طب، ہندسہ جیسے علوم سیکھنا چاہئے تاکہ وہ غیر مسلموں کے محتاج نہ ہوں۔ البتہ یہ خیال کہ ان علوم کا سیکھنا ہی دراصل علم کی تکمیل سے عبارت ہے ہمارے فکری چوکھٹے میں اب تک پوری طرح نہیں سما سکا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم اہل فکر کتاب وحکمت کے اس امتزاج اور اس کے مضمرات کا کسی حد تک ادراک کریں۔ البتہ جو لوگ عرصے سے علماء یہود کی طرح علم کی شرعی اور غیر شرعی تقسیم کے قائل رہے ہیں ان کے لئے کسی ایسی حقیقت کا ادراک تقلیب فکر ونظر کے بغیر ممکن نہ ہوگا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کے بغیر اور دوسرا کوئی مختصر راستہ ہے بھی نہیں۔